اِمکان

خورشید رضوی

اِمکان

عابد صدیق کے نام

اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ ای

بپا دل میں پیہم یہ ماتم رہا
مجھے اپنے امکان کا غم رہا

ترتیب

پیش لفظ

شاعری انسان اور کائنات کے رشتے کا ایک اظہار ہی تو ہے۔ سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ کائنات کے روبرو اس تحیر اور تفکر' اس بہجت اور سرخوشی' اس حزن وملال کو وصول کرے جو اس کا مقدر ہے۔ یہی راستہ محسوسات اور وجدان تک جاتا ہے۔ غالب نے کہا تھا:

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اور یہ بھی کہہ دیا:

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

کائنات کے ازلی اسرار کو سامنے موجود پا کر اس کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک حجاب کے بعد دوسرا حجاب۔ ایک راز کو (اپنی دانست میں) پا کر دوسرے راز کے روبرو ہو کر ششدر رہ جانا کوئی معمولی سعادت نہیں ہے۔ یہ فلسفیوں' مفکروں اور شاعروں کا مقدر ہے۔ یہی داخلی کیفیت محسوساتی سطح پر طبیعت کو وجدان عطا کرتی ہے اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ان محسوسات' اِن داخلی کیفیات اور اس وجدان کو شعر کے سانچے میں ڈھال لینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہ روحانی تجربہ کیسے لفظوں کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے' اس کا کوئی آسان نسخہ دریافت نہیں ہو سکا۔ یہ کیفیت شعر کا کیا روپ اختیار کرتی ہے' غزل کے سانچے میں ڈھلتی ہے یا نظم کا پیکر استعمال کرتی ہے' یہ داخلی کیفیت کی مجبوری کے علاوہ شاعر کی تربیت' شاعر کی ترجیحات اور اظہار کی قدرت پر منحصر ہے اور غالباً اس امر پر بھی منحصر ہے کہ شاعر کس سرزمین پر اور کس دور میں شعر گوئی کر رہا ہے۔ کیونکہ یہی دو باتیں اس کو ادب کی روایت اور اس کے عہد سے وابستہ کرتی ہیں۔

یہاں ایک ایسے واقعے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو بعض دوستوں کے ہاں بادی النظر میں کوئی خاص معانی نہیں رکھتا یعنی خورشید رضوی صاحب کا لاہور میں قیام۔ دوست کہیں گے اس کا بھلا شاعری سے کیا تعلق ہو مگر میری دانست میں یہ ایک قابلِ توجہ امر ہے۔ ہر چند کہ نقادوں اور محققوں نے کبھی دبستانِ لاہور کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن واقع یہی ہے کہ لاہور میں گزشتہ سو برس میں اُردو ادب کی ایک نئی روایت پھولی پھلی ہے۔ یہ روایت اقبال کی شاعری سے ہو کر بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں جدید شاعری کی تخلیق اور فروغ سے ہوتی ہوئی حلقہ ارباب ذوق کی تربیت گاہ تک پہنچتی ہے۔ یہ ادارہ 1939ء میں قائم ہو گیا تھا۔

اس موقع پر ایک بات اگر زیرِ نظر رہے تو مناسب ہوگا۔ ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا کہ جب لاہور سے مولوی محبوب عالم نے "پیسہ اخبار" کا اجرا کیا تو مولانا حالی نے انہیں اپنے پیغام میں لکھا:

"جو لوگ پنجابی اُردو پر نکتہ چینی کرتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اُردو زبان ان کے ہاتھوں سے نکل کر پنجاب میں جا رہی ہے۔ اگر یہی سلسلہ مدت تک جاری رہا تو جس طرح عربی زبان عرب سے نکل کر مصر اور شام میں چلی گئی یقیناً وہ وقت دور نہیں ہے کہ دلی اور لکھنؤ کی بجائے لاہور اُردو کا گھر ہو جائے گا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے گا"۔

میری ناچیز رائے میں اس بحث کا فیصلہ تو نہ ہو سکا لیکن مولانا حالی کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ اسی لیے میں نے دبستانِ لاہور کی اصطلاح استعمال کرنے کی جرأت کی ہے۔

1938ء کے آتے آتے اقبال کی شاعری تو اُردو شاعری کی کلاسیک میں شامل ہو چکی تھی لیکن اس کے بعد اُردو شعر میں ایک بغاوت کا دور شروع ہوتا ہے جسے اس دور میں جدید شاعری کا نام دیا گیا۔ یہ بغاوت ایک نئی جہت کی تلاش بھی تھی اور دریافت بھی تھی۔ یہ فیض، راشد اور میرا جی کا دور تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اُردو زبان اور اُردو شاعری کی روایت سے کماحقہٗ واقف تھے۔ یہ بغاوت جہالت نہیں علم کی بنیاد پر ہوئی تھی۔

عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے دنوں حلقہ ارباب ذوق کے 2003ء کے سالانہ جلسے کی

صدارت کا قرعۂ فال خورشید رضوی کے نام پڑا اور انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں یہی بات ان لفظوں میں کہی۔

"روایت کے سانچے جب فرسودگی میں ڈھلنے لگتے ہیں تو تخلیق کی تازہ کاری انہیں توڑ ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس کرتی ہے اور یقیناً اس کا حق بھی رکھتی ہے۔ لیکن اصولی طور پر کسی بھی روایت کو توڑنے یا رد کرنے کے لئے اس کا علم اور اس پر قدرت رکھنا شرط ہے۔ چنانچہ خود روایت شکنی کے لئے روایت کو جاننا اور عملاً اس پر قادر ہونا ضروری ہے۔ اس علم اور قدرت کے بغیر روایت کے خلاف بغاوت کا نعرہ دراصل اپنی کمزوری کو چھپانے کا ایک بہانہ ہوتا ہے"۔

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں پنجاب میں جدید شاعری جس بغاوت کی پیغامبر تھی اس کے پیچھے اس عہد کے نئے شاعروں کی اردو شاعری کی روایت سے پوری واقفیت اور آگہی تھی۔ راشد، فیض اور میراجی جو اس تحریک کے پیش رو تھے روایت کی فرسودگی سے واقف نہ ہوتے تو یہ تحریک کامیاب نہ ہوتی۔ نئی نظم اور نئی غزل تخلیق ہونا شروع ہوئی۔ یہ روایت سے قطع تعلق نہیں روایت کو آگے لے جانے کا شعوری عمل تھا جس کے لئے روایت کے فہم کے ساتھ ساتھ کچھ تبدیلیاں بھی لازم تھیں۔ نظم کو قافیے اور ردیف کی قیود سے آزاد کرنا مشکل سہی مگر ممکن بھی تھا۔ البتہ غزل کو ردیف اور قافیے سے آزاد کرنا بے معنی ہوتا۔ دوسری طرف اردو غزل کے فارم میں وہ جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ غزل تو راشد نے بھی لکھی اور میراجی نے بھی لکھی مگر بے دلی سے لکھی۔ مگر جدید اردو شاعری کے ان بانیوں میں سے ایک شاعر جس نے اردو غزل کو جدید تر مضامین سے مالا مال کرتے ہوئے ایک نیا لحن عطا کیا وہ فیض احمد فیض تھے۔ ہر چند کہ راشد اور میراجی غزل گوئی سے گریزاں رہے لیکن واقع یہی ہے کہ اس تحریک کی برکت سے غزل بطور صنف سخن قائم بھی رہی اور اس پر نئے مضامین اور نئے طرز اظہار کے دروازے کھل گئے۔

یہاں اس دلچسپ سلسلے میں ایک بات عرض کرتا چلوں۔ ن م راشد صاحب سے متعلق میرے پاس جو مخطوطے اور مکتوبات محفوظ ہیں ان میں ان کا ایک خط وہ بھی ہے جس پر دو جون

1953ء کی تاریخ درج ہے اور جو نیویارک امریکہ سے لکھا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک غزل کہی ہے۔ اس کے چند شعر اس مختصر سی جگہ میں لکھ رہا ہوں۔ کس قدر Labourd غزل ہے۔ غزل کہنے کے بعد ہمیشہ یہی احساس ہوا۔ الفاظ اور معانی کے بے معنی ہیر پھیر کا احساس۔ قافیہ بازی کی رہنمائی اکثر گمراہی کا باعث ہوئی۔ پیش پا افتادہ فلسفہ بھی اپنایا نہ جا سکا تو اپنا کوئی فلسفہ حیات پورے طور پر غزل کے بطن میں راہ پا سکا۔''

دوسری طرف واقعہ یہ ہے کہ میری دانست میں راشد صاحب کی یہ غزل نہایت اچھی غزل ہے اور بعض شعر تو پڑھتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں لیکن یہ موقع اس غزل کے تذکرے کے لئے مناسب نہیں۔ ان کا یہ خط غزل کے بارے میں راشد کے خیالات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ راشد صاحب کا بیشتر وقت اس سرزمین سے دور گزرا۔ پہلے ایران میں اور پھر کئی برس امریکہ میں قیام کیا اور پھر جب یو این او کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو واپس آنے کی بجائے انگلستان کو اپنا گھر بنا لیا۔ سال دو سال کے بعد رخصت پر وطن آتے تو ملاقاتیں مختصر اور گفتگو سے لبریز ہوتیں۔ افسوس کہ اس مضمون پر ان سے گفتگو نہ ہوئی۔ میری ناچیز رائے میں قافیہ تو ایک طلسماتی دروازہ ہے جس سے گزر کر شاعر پر وہ کیفیت اور وہ مضمون وارد ہوتا ہے جس سے وہ خود بھی چند لمحے پہلے تک واقف نہ تھا۔ یہ ایک ذاتی عمل ہے جو بالکل منفرد ہے اور شاعر کی ذات سے وابستہ ہے۔ وہ جو اردو کے ایک عظیم شاعر نے کہا تھا ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'' غالباً اس کا بھی یہی مفہوم تھا کہ شعر کا مضمون شاعر کی شخصیت کی پراسرار تہوں میں محفوظ پڑا ہوتا ہے اور ایک لمحہ معرفت میں برآمد ہو کر اس پر وارد ہوتا ہے۔ اس لمحہ معرفت کی ایک کلید تو قافیہ بھی ہے۔ یقین نہ آئے تو آئیے ایک فرضی اور خیالی مشاعرے کا انعقاد کریں۔ یہ ایک طرحی مشاعرہ ہوگا اور اس میں میر تقی میر، اقبالؔ اور غالبؔ شریک ہیں۔ ردیف تو خیر اپنے آپ کو دہرا کر مسلسل ایک صوتی موسیقی پیدا کرے گی لیکن طرحی مصرعے کے قافیے تو زیادہ سے زیادہ دس بارہ نہیں تو پندرہ بیس ہوں گے لیکن اندازہ کیجئے کہ ایک ہی قافیہ جو مضمون غالبؔ پر وارد کرے گا وہ اس مضمون سے کس قدر مختلف ہوگا جو اقبالؔ پر وارد ہوگا اور میر تقی میرؔ اسی قافیے کی بدولت جس کیفیت سے دوچار ہو جائیں گے وہ ان دونوں کے اشعار

سے کس قدر مختلف کیفیت ہوگی۔ یہ سب قافیے ہی کے تو کمالات اور کرشمے ہیں۔ لیکن اگر شاعر روایتی ہے تو قافیہ اس کے لئے جو مضمون اپنے ساتھ لائے گا وہ بھی روایتی ہوگا۔

یہاں پہنچ کر مجھے جدید شاعری کے تذکرے میں میراجی کی ایک تحریر کا خیال آ گیا جو راشد صاحب کے اس خط سے کم و بیش بیس برس پہلے کی ہے۔ میراجی اپنے مضمون بعنوان "نئی شاعری کی بنیادیں" میں جو اپریل 1934ء کے شمارہ "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہوا' لکھتے ہیں:

> "نئی شاعری ہر اس موزوں کلام کو کہا جا سکتا ہے جس میں ہنگامی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے' سوچنے اور بیان کرنے کا انداز نیا ہو یعنی کوئی شاعر روایتی بندھنوں سے آزاد ہو کر اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے تو وہ نیا شاعر ہے ورنہ پرانا"۔

میراجی کے اس بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ نئی شاعری کے سلسلے میں غزل یا نظم کی کوئی قید نہیں۔ صنف سخن کوئی بھی ہو امتحان یہی ہے کہ شاعر نے روایتی بندھنوں سے آزاد ہو کر کس حد تک اپنی انفرادیت کو نمایاں کیا۔ میراجی کے اس امتحان میں فیض سے زیادہ کون سرخرو ہوگا۔ جدید شاعری کے ان بانیوں میں سے میراجی اور راشد نے تو غزل کو ترک کیا اور ان کا شاعرانہ اظہار بیشتر نظم ہی میں محفوظ ہوا لیکن فیض صاحب نے اپنی غزل گوئی سے یہ بات واضح کر دی کہ غزل بھی اپنی روایتی بندشوں سے آزاد ہو سکتی ہے۔ فیض نے اپنے قید و بند' اور زندان و سلاسل کے گہرے تجربات کا اظہار غزل میں کچھ ایسے کیا کہ روایتی ترکیبات اور کلاسیکی تصورات نئے معانی سے جگمگا اٹھے۔ وہی لفظیات' وہی اسلوب جو روایتی شاعروں کے ہاں گھس پٹ کر بے کیف ہو چکا تھا' جب فیض نے اپنے نئے تجربے اور سیاسی نظریے کے اظہار کے لئے استعمال کیا تو اردو غزل کو ایک نیا اسلوب مل گیا۔

نئی اردو غزل کے سلسلے میں ایک اور اہم صورت حال ایسی ہے جس پر توجہ کے بغیر یہ تبدیلی کلی طور پر گرفت میں نہیں آ سکتی۔ جب دبستان لاہور نئی نظم اور نئی غزل کی تلاش اور دریافت کے مقام سے گزر رہا تھا تو برصغیر کی اردو شاعری کے تاریخی مراکز یعنی دلی' لکھنؤ اور

حیدرآباد میں غزل اپنی نئی شان اور نئی چاشنی کے ساتھ فروغ پا رہی تھی۔ داغ دہلوی، فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی سے گزر کر اب جگر، جوش، فراق اور یگانہ، گویا ایک پورے کا پورا مکتب اس نئی غزل کی آبیاری کر رہا تھا اور کلاسیکی غزل اب نئی آب و تاب سے جلوہ گری کر رہی تھی۔ اس صورت حال میں ایک مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خورشید رضوی کے گھرانے کی روایت اور رہائش امروہہ سے وابستہ ہے اور وہ خود اپنی روایت اور رہائش کے اعتبار سے لاہور سے وابستہ ہیں۔ اور یوں ان کی غزل گوئی کلاسیکی اور ماڈرن دونوں روایتوں سے فیض یاب ہوئی ہے۔

شہزاد احمد شہزاد کی رائے میں "خورشید رضوی غزل کے ان شعراء میں سے ہیں جن کی وابستگی جدید علوم سے اتنی ہی گہری ہے جتنی خود غزل کے کرافٹ سے" لیکن واقع یہ ہے کہ نئی شاعری کے اس کامیاب تجربے کے بعد اردو شاعری کی وہ روایت پختہ ہوگئی جس کا آغاز اقبال کر چکے تھے یعنی ایک ہی شاعر غزل گوئی بھی کر سکتا ہے اور نظم نگاری بھی کر سکتا ہے۔ شاعری کا مضمون اور احساساتی تجربہ البتہ اپنی صنف اظہار اپنے ساتھ لائے گا۔ دوسرے لفظوں میں "مسجد قرطبہ" نظم کا مضمون ہے غزل کا نہیں۔

اس کے بعد آنے والی نسلوں کے لئے یہ کام آسان ہوگیا۔ آج کا اردو شاعر چاہے تو مثنوی نظم لکھے چاہے تو معرا اور جب غزل وارد ہو تو اس سے بھی حجاب نہ کرے۔

آج ہمارے درمیان جو احباب اعلیٰ پائے کی قابل توجہ شاعری کر رہے ہیں۔ ان میں ایک موقر اور معتبر نام خورشید رضوی ہے۔ جن کے کلام کے تین مجموعے قاری تک پہنچ چکے ہیں۔ اور چوتھا مجموعہ "امکان" آپ کے سامنے ہے۔ اس میں "تہ دل" "جزیرہ" "مدینے میں" "سالگرہ" اور "ہوک" قابل توجہ نظمیں ہیں۔ توجہ کیجئے تو معانی کے پرت کھلتے چلے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ غزل کا ایک سدا بہار گلزار ہے مگر زمین اور مضمون روایتی نہیں ہیں۔ قافیے جو مضمون اپنے ساتھ لاتا ہے وہ بالکل ذاتی اور منفرد ہے۔ البتہ صنف شعر کے مختلف ہونے کے باوجود کثر تخلیق کار کے تشخص کی جھلک ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ گویا غزل ہو یا نظم شاعر کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی۔

''حمد'' اس مجموعے کی پہلی نظم ہے جس میں حقیقت کاملہ کو ''جانِ تنہائی'' کہا گیا ہے۔
میں نے پڑھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ تنہائی تو اس طرف ہے' کیا اُس طرف بھی تنہائی ہے مگر معانی کے دوسرے ریلے میں خیال آیا کہ تنہائی تو صرف ادھر ہے اُدھر تو یکتائی ہے اور یکتائی میں غالباً تنہائی نہیں ہوتی۔ دل اس نکتے پر مطمئن ہونے کو تھا کہ چند صفحوں بعد غزل کا یہ شعر سامنے آ گیا:

خدا بھی خلق میں چاہے کہ آئنہ دیکھے
اُسے بھی راس نہ آیا سرور یکتائی

تو کیا پہلا خیال ہی درست تھا کہ تنہائی دونوں طرف ہے' ادھر بھی اور اُدھر بھی۔ مگر اصل چیز تو اس کائنات ہست و بود میں اکیلے انسان کا یہ کمال ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ چند روزہ زندگی حیات مستعار ہے نہ اپنی ذات سے الگ ہو سکتا ہے نہ اسے ترک کر سکتا ہے۔ کیا ہر ایک ذات اس کی عطا کی ہوئی یکتائی ہے۔

یہ اعتماد تو دیکھو بھرے سمندر میں
حباب کھینچ کے بیٹھا حصار تنہائی

(کیا اس مقام پر یہ بات قابل توجہ ہو سکتی ہے کہ خورشید رضوی کے سب سے پہلے مجموعے کا نام ''شاخ تنہا'' تھا)

ذرا آگے چل کر ایک نظم ہے ''شیشے کی دیوار'' جس کے چار مصرعوں میں اس خیال کی گونج اس طرح سنائی دیتی ہے۔

''ذات کا خول بہت پختہ ہے
بے در' بے روزن
اندر کی باتیں ہیں اندر
باہر کی اُس پار''

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل توجہ نظم ''جزیرہ'' ہے۔

''مری زندگی اب

انا کے جزیرے میں سلکرک کی زندگی ہے۔
کوئی لمس، کوئی صدا، کوئی خوشبو کوئی ذائقہ، کوئی چہرہ شناسا نہیں ہے
سمندر کی نمکین لہروں میں
اپنے ہی چہرے کے بنتے بگڑتے خدوخال سے زندگی میں نمک ہے
مری ناتواں انگلیاں وقت کی آہنی انگلیوں کے فشارِ مسلسل میں تھکنے لگی ہیں"

"تہ دل" ایک بے حد تہ دار نظم ہے جس میں شاعر اپنی ذات کے ہر پہلو سے شناسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ذات جس کے اندر طہارت بھی موجود ہے اور نجاست بھی، یقین بھی موجود ہے اور گمان بھی، یک روئی بھی موجود ہے اور تضاد بھی۔ مگر شاعر اس طہارت سے خوفزدہ ہے:

"جو طہارت چوبِ منبر کو بنائے چوب دار
اے تہ دل اس طہارت سے بہت ڈرتا ہوں میں"

شاعر اپنی ذات کی اس نجاست سے بھی ڈرتا ہے:

"جس کا اک قطرہ
سمندر کو بھی آلودہ کرے"

اور نظم کا خاتمہ ان مصرعوں پر ہوتا ہے:

"اے تہ دل
اے بلائے جاودانی
اے سیہ ناگوں کے بل
میرے سینے میں گڑی میری صلیب
اے معمائے عجیب"

اور جب یہی "معمائے عجیب" غزل میں وارد ہوتا ہے تو کیسا شاندار شعر اپنے ساتھ لاتا ہے۔

دیکھ رہا ہوں دور سے اپنی شبیہ سربلند
میں تمہیں بستہ رسن پھر سر دار کون ہے

تو گویا ذات جب اپنے جزیرے سے باہر آتی ہے تو کائنات کا جزو بن جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ نظم اور غزل کے مضامین کا یہ امتزاج تخلیقِ شعر کے پیچھے ذات کی اکائی کا مظہر ہے۔ شاعری کی صنف چاہے بدل جائے' نظم ہو یا غزل' اس کے پیچھے جو شخصیت ہے وہ بہرحال غیر منقسم ہے۔

اب اس مجموعے میں شامل ایک جاوداں شعر سنا کر اجازت چاہتا ہوں۔

آج بھی بزم میں ہیں رفتہ و آئندہ کے لوگ
ہر زمانے میں ہیں موجود زمانے سارے

اعجاز حسین بٹالوی

لاہور' 28 جولائی 2003ء

حرفِ سپاس

اس مجموعے کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا بجز اس کے کہ میں اپنے مشفق و کرم فرما جناب اعجاز حسین بٹالوی کا بہت بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے بے حد مصروف ہونے کے باوجود وقت نکالا اور نہایت مفصل اور فکر انگیز پیش لفظ تحریر فرمایا جو میرے لئے باعث اعزاز ہے۔ میرے بیٹے عامر نے ان غزلوں اور نظموں کی بہم آوری میں مدد دی' برادر عزیز عابد سیال کے خلوص نے کمپوزنگ کا نقش درست کیا اور برادرم صفدر حسین کی محبت انہیں موجودہ شکل میں آپ تک پہنچانے کا وسیلہ بنی۔ میں ان سب کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خورشید رضوی

لاہور

۲۲ ستمبر ۲۰۰۳ء

حمد

جانِ تنہائی!
تغیّر کے سمندر میں ترا دستِ دوام
نور کے مینار کی صورت
مری ڈھارس بندھاتا ہے مدام

سب گزرتے جا رہے ہیں، کوہ و صحرا، خار و خس
وقت ہے اور اعتبار اور جسم
پے در پے طلسم
اور ان کے درمیاں دل
ایک طائر ہے، قفس اندر قفس

تیرے پرتو ہے مگر اس کے لئے ذوقِ یقیں، اذنِ وجود
تیرا پرتو و مبدم ردِّ طلسمِ دیر و زود
عینِ شب میں صبحِ روشن کی نوید
تیرہ دروازوں کی نورانی کلید
تیرا اسم

مدینہ میں

کیا حسیں گنبد و محراب ہیں لیکن مرا دل
ڈھونڈتا ہے وہی مٹی کے مکاں
چھت پہ وہی عود و نخیل
اور دروازوں پہ حجروں کے
یہ اُون کے موٹے پردے

ڈالنا چاہتا ہوں سر پہ وہی خاکِ ریاضِ جنت
پے بہ پے جس میں وہ تابندہ قدم آتے تھے
ہائے وہ سادہ سا منبر ہے کہاں
رشک سے جس کے ہوئی گریہ کناں حنانہ

میرا دل صورتِ غربال ہے یادوں سے فگار
چھاننا چاہتا ہے خاکِ بقیع
جس میں ہیں اتنے ستارے کہ فلک پر بھی نہیں

اے اُحُد تجھ سے محبت ہے مجھے
اے اُحُد تجھ سے محبت تھی مرے مولاؐ کو
اے اُحُد تجھ کو محبت تھی مرے مولاؐ سے

اے اُحُد آج بھی دامن میں ترے
ہے وہی ہیبتِ حمزہؓ کا جلالِ نفسِ بازپسیں
جیسے اک شیر کی آنکھ
کسی روبہ پہ ٹھہر جائے حقارت لے کر

شاہراہیں ہیں کہ اژدر ہیں جو لٹکے ہوئے ہیں
کتنے نشیب اور فراز
جن سے وابستہ مرا کھویا ہوا حافظہ ہے

مدینہ میں

کیا حسیں گنبد و محراب ہیں لیکن مرا دل
ڈھونڈتا ہے وہی مٹی کے مکاں
چھت پہ وہی عودِ نخیل
اور دروازوں پہ حجروں کے
یہ اُون کے موٹے پردے

ڈالنا چاہتا ہوں سر پہ وہی خاکِ ریاضِ جنت
پے بہ پے جس میں وہ تابندہ قدم آتے تھے
ہائے وہ سادہ سا منبر ہے کہاں
رشک سے جس کے ہوئی گریہ کناں حنانہ

میرا دل صورتِ غربال ہے یادوں سے فگار
چھاننا چاہتا ہے خاکِ بقیع
جس میں ہیں اتنے ستارے کہ فلک پر بھی نہیں

اے اُحُد تجھ سے محبت ہے مجھے
اے اُحُد تجھ سے محبت تھی مرے مولاؐ کو
اے اُحُد تجھ کو محبت تھی مرے مولاؐ سے

اے اُحُد آج بھی دامن میں ترے
ہے وہی ہیبتِ حمزہؓ کا جلالِ نفسِ بازپسیں
جیسے اک شیر کی آنکھ
کسی روبہ پہ ٹھہر جائے حقارت لے کر

شاہراہیں ہیں کہ اژدر ہیں جو نکلے ہوئے ہیں
کتنے نشیب اور فراز
جن سے وابستہ مرا کھویا ہوا حافظہ ہے

خوں رلاتی ہے مجھے چشمِ تصور کی بھی نابینائی
کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کہاں کیا کیا تھا
تف ہے اے چشمِ تصور تجھ پہ

اشک بہتے ہیں تو بہنے دے کہ ان آنسوں میں
شاید اُس گزرے ہوئے وقت کی تصویریں ہوں
جو مرے دل سے گزرتا ہی نہیں

○

سحر آئینہ کچھ ایسا ہے کہ ڈر پیدا ہو
بول کچھ بول کہ دیوار میں در پیدا ہو

پھر وہی سلسلۂ نقشِ قدم دکھلا دے
چشمکِ برقِ رواں ، بارِ دگر پیدا ہو

دل وہ پاگل ہے کہ ہو جائے گا غرقاب وہیں
جھیل کی تہ میں اگر عکسِ قمر پیدا ہو

حُسن ہے حُسن وہی جس کے مقابل آ کر
دیدۂ کور میں بھی تارِ نظر پیدا ہو

ہم نمائش کے تو قائل نہیں لیکن خورشید!
خود کو پنہاں بھی زمانے سے نہ کر ، پیدا ہو

○

کچھ بھی تو نہیں حسرت و حیرت کے علاوہ
آئینے کے اندر، تری صورت کے علاوہ

جس پھول کو دیکھوں یہی لگتا ہے کہ اس میں
اک رنج بھی رہتا ہے، مسرت کے علاوہ

ہر جبر سے خاموش گزر آئے کہ افسوس
سر بھی ہمیں درکار تھا، عزت کے علاوہ

ہم نے بھی بہت غور کیا رازِ جہاں پر
حکمت نہ کھلی کوئی، مشیت کے علاوہ

جی چاہتا ہے پھر سے ملیں، اور دلوں میں
کچھ اور تعلق ہو، محبت کے علاوہ

○

مئے پنہاں کبھی پیمانے سے باہر بھی دمک
اے غمِ دل! کبھی آنکھوں میں بھی ایک آدھ جھلک

دل میں اک خوابِ حسیں، ذہن میں اندوہِ معاش
اور دروازے پہ ایام کی پیہم دستک

زنگ آلود سلاسل کہ جو بج بھی نہ سکیں
پاؤں میں کہنہ زمیں، سر پہ یہ فرسودہ فلک

فن ہے وہ آہوئے وحشی کہ لئے پھرتا ہے
سرِ صحرائے فنا ، خلد کے باغوں کی مہک

ہے کوئی شے مرے اعماق کے اندر روشن
جس طرح حُجرۂ تاریک میں سونے کی ڈلک

سحر ایسا کہ مسخر کرے گویائی کو
حُسن ایسا کہ پلک سے نہیں لگتی ہے پلک

بجھتی آنکھوں میں اک اُمید ابھی کہتی ہے
ڈوبتے دل سے کہ دو چار گھڑی اور دھڑک

ہے تہِ دل میں کہیں ریزۂ الماس ابھی
چشمِ گریاں سے کہو اور چھلک اور چھلک

لب تو خورشید سے کھولے نہ گئے وقتِ وداع
نبض میں رہ گئی جاتے ہوئے قدموں کی دھمک

شہرِ خواب

خوابوں میں بستا ہے کہیں
اک شہر جو دیکھا نہیں
جس شہر کی تقدیر پہ
افسوس کا سایہ نہ ہو

حاکم ہو ایسا داد رس
چلتا نہ ہو ظالم کا بس
یہ بھی اگر ممکن نہ ہو
تو پنجۂ مظلوم کو
حاصل ہو اتنی دسترس
زنجیر تک آیا کرے
زنجیر ہل جایا کرے
انصاف مل جایا کرے

○

صبح سے چاک بھی ہو دامنِ شب، ضد ہے اُسے
عینِ ماتم میں سجے بزمِ طرب، ضد ہے اُسے

خود ہر اک بات سے واقف ہے مگر اوروں کو
کچھ نہیں جاننے دیتا، یہ عجب ضد ہے اُسے

اُس کو سب ایک ہے یوں، درد و سکوں، وصل و فراق
ہاں مگر میری تمنا کے سبب ضد ہے اُسے

بات اپنوں کی پکڑ لے تو کہاں چھوڑتا ہے
درگزر غیر سے فرمائے، تو کب ضد ہے اُسے

سر اگر خم ہے تو محفوظ خمِ تیغ سے ہے
اور اگر زیرِ سپر ہے تو غضب ضد ہے اُسے

سن کے قاصد نے کہا میری دلیلیں خورشیدؔ!
خیر پہلے جو نہیں بھی تھی تو اب ضد ہے اُسے

○

خون سے لکھتا ہوں اور لفظ میں ٹھہراتا ہوں
پھر بھی عکسِ دلِ بے تاب کہاں پاتا ہوں

اے صدائے نہ شنیدہ، تو کہیں ہو کہ نہ ہو
پا بُریدہ میں تری سمت کھچا آتا ہوں

ہاں مجھے گرمیِ بازار سے کچھ ربط نہیں
جو شکستہ ہو گہر، چُن کے اٹھا لاتا ہوں

صحبتِ اہلِ زمانہ مجھے کیا راس آتی
شور سے بھاگتا ہوں، زعم سے گھبراتا ہوں

زخم کھاتا ہوں دلِ زار سے باہر خورشیدؔ!
اور پھر کنجِ دلِ زار میں ستاتا ہوں

○

عالمِ شکر میں جو کہتا ہوں ، کہنے دے مجھے
میرے اندر تو یہی کچھ ہے ، سو رہنے دے مجھے

آ کبھی لمس کو یکسر نظر انداز کریں
آنکھ سے آنکھ مِلا ، خون میں بہنے دے مجھے

دور جا کر بھی مری روح میں موجود نہ رہ
تو کبھی اپنی جدائی بھی تو سہنے دے مجھے

تو مجھے بنتے بگڑتے ہوئے اب غور سے دیکھ
وقت کل چاک پہ رہنے دے ، نہ رہنے دے مجھے

جانِ خورشید ! مجھے سائے سے محروم نہ رکھ
میں گہن میں اگر آتا ہوں تو گہنے دے مجھے

○

وہی موسم ہے، وہی گُل، وہی خوں ریز ہوا
مار ہی ڈالے نہ ہم کو یہ جنوں خیز ہوا

دل آشفتہ، شجر ہیں، نہ فصیلیں، نہ پہاڑ
کچھ نہیں راہ میں آتی ہے بہت تیز ہوا

دن کو کرتی ہے کڑی دھوپ چمن کو پامال
شب کو آتی ہے اُڑاتی ہوئی شبدیز ہوا

دل پہ اب شہرِ خموشاں کی خموشی ہے محیط
کچھ بھی حاصل نہیں اے ولولہ انگیز ہوا

کہیں منظر نہ بدل جائے یکا یک خورشید
کہیں آندھی میں نہ ڈھل جائے دل آویز ہوا

○

گُل کھلاتی ہے، کبھی خاک اُڑاتی ہے یہ خاک
شعبدے کرتی ہے، نیرنگ دکھاتی ہے یہ خاک

میں تو خود خاک ہوں میرا تو بھلا کیا مذکور
آسمانوں سے ستاروں کو بلاتی ہے یہ خاک

سال ہا سال کھلاتی ہے جسے رزق اپنا
آخرِ کار اُس انسان کو کھاتی ہے یہ خاک

سب سے آخر میں اُبھارے تھے جو رفتہ رفتہ
سب سے پہلے وہ خدوخال مٹاتی ہے یہ خاک

ہے کبھی جسم، کبھی قبر کی مٹی خورشید
جس طرف جاؤں، مری راہ میں آتی یہ خاک

شیشے کی دیوار

دل کا دکھ اور سوچ کے دھارے
اب تک ہیں بے کار
پانی میں ہے بند جزیرہ
میان میں ہے تلوار

ذات کا خول بہت پختہ ہے
بے در، بے روزن
اندر کی باتیں ہیں اندر
باہر کی اُس پار

ہونٹ ہلیں، آواز نہ آئے
بات چھپائے، روپ دکھائے
شیشے کی دیوار

○

زمیں کا رزق ہے یا سوئے آسماں گئی ہے
ہمارے گنبدِ دل کی صدا کہاں گئی ہے

ملے کہاں سے کہ اب رائگاں نہ ہونے دوں
یہ زندگی تو مری سخت رائگاں گئی ہے

میں دل ہی دل میں نشیمن کی خیر مانگتا ہوں
چمن کی سمت صبا یوں تو مہرباں گئی ہے

گماں یہی تھا کہ اب وہ شبیہِ خون آلود
چلی گئی تہِ دل سے مگر کہاں گئی ہے

یہ سوچتا ہوں بھٹکتی ہوئی نظر اے کاش
وہیں وہیں پہ نہ جاتی جہاں جہاں گئی ہے

ہر ایک شے پہ مجھے اعتبار آنے لگا
یقیں کی لہر بہ اندازۂ گماں گئی ہے

سمجھ نہ خود کو تو اے بحرِ بیکراں تنہا
نظر بھی ساتھ ترے ہو کے بے کراں گئی ہے

ہزار ساعتِ آئندہ خون روتی ہے
یہ چشمِ نم جو کبھی سُوئے رفتگاں گئی ہے

یہ موج ، اس کو چٹانوں پہ سر پٹکنا ہے
جو آبشار کی جانب رواں دواں گئی ہے

ہر ایک نیند میں ڈوبے ہوئے شبستاں تک
بلا سے کوئی نہ جاگے ، مگر اذاں گئی ہے

○

ہوا کے زور پہ چلنا بھی چاہیے کچھ کچھ
مگر ہوا کو بدلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

بجا کہ خوب ہے یہ سحرِ چشم و آئینہ
اب ان حدوں سے نکلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

گہر جو خواب کے آسودہ ہیں تہِ دل میں
انھیں تہوں سے اچھلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

زمانے کو جو ہمیں ڈھالتا رہا ہے سدا
ہمارے رنگ میں ڈھلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

جما ہوا ہے لہو تہ بہ تہ رگِ جاں میں
ہمیں لہو یہ اگلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

○

کہیں بھی مقامِ صدائے لب نہیں آ سکا
میں تری صدائے نگہ پہ کب نہیں آ سکا

ترے ہجر، تیرے وصال، اپنے خیال میں
کسی آئنے میں، میں سب کا سب نہیں آ سکا

ترے قرب میں مجھے موت یاد نہیں رہی
وہ سحر ہوئی کہ خیالِ شب نہیں آ سکا

جو تمام عمر رہا سبب کی تلاش میں
وہ تری نگاہ میں بے سبب نہیں آ سکا

ہوئی ایسے سایۂ رنج میں مری تربیت
کبھی کوئی وسوسۂ طرب نہیں آ سکا

یہ مری متاعِ گراں ہوا میں بکھر گئی
مجھے اپنے سوزِ نہاں کا ڈھب نہیں آ سکا

○

حیراں ہوں میں کیونکر سرِ خاک سے گزرا
شعلہ سا سمٹتا ہوا خاشاک سے گزرا

ہر دیکھنے والے کا مقدر یہی حیرت
ہر سوچنے والا اسی پیچاک سے گزرا

آلائشِ دنیا میں ٹھہرنے نہیں پایا
منظر جو نواحِ نگہِ پاک سے گزرا

اب لطفِ سخن ہو کے کھلے گا ترے لب پر
وہ پھول جو رنگینیِ پوشاک سے گزرا

اے گردشِ ایام مرے دل پہ نظر کر
ایسا بھی کوئی جام ، ترے چاک سے گزرا

اے خالقِ امکاں ترے زندانِ قضا میں
کیا کیا نہ ہمارے دلِ غم ناک سے گزرا

جب انجمِ افلاک اترتے تھے زمیں پر
میں گرد ہُوا اور سرِ افلاک سے گزرا

تہِ دل

اے تہِ دل
رونمائی سے تری ڈرتا ہوں میں
اے تہِ دل
تو کنواں ہے اور مَیں یوسف ہوں
کچھ مایوس، کچھ مانوس
تیرے بطن میں
تیرے سوتوں سے کہیں زہراب رستا ہے
کہیں آبِ حیات

اے مرے دل

تجھ میں ہے کتنی طہارت

تجھ میں ہے کیسی نجاست

تجھ میں ہیں کتنے گماں، کتنے یقیں

کتنے تضاد

اے مرے دل، رونمائی سے تری ڈرتا ہوں میں

اے مرے دل

تجھ میں ہے کتنی طہارت

اہلِ ظاہر جس کی تابانی کے آگے خیرہ چشم

اہلِ فتویٰ جس کے آئینے کے آگے روسیاہ

جو طہارت چوبِ منبر کو بنائے چوبِ دار

اے مرے دل اُس طہارت سے بہت ڈرتا ہوں میں

اے مرے دل

تجھ میں ہے کیسی نجاست

جس کا اِک قطرہ

سمندر کو بھی آلودہ کرے

اہلِ ظاہر کی صدائے آفریں کے باوجود
جس کی آمیزش سے لگتا ہے مجھے
حُسنِ عمل، کارِ گناہ
اے مرے دل، اُس نجاست سے بہت ڈرتا ہوں مَیں

اے مرے دل
اے بلائے جاودانی
اے سیہ ناگوں کے بل
میرے سینے میں گڑی میری صلیب
اے معمائے عجیب

○

جذبے کی کوئی شکل بنانی ہی پڑے گی
سونے میں مجھے کھوٹ ملانی ہی پڑے گی

یوں لاکھ رہیں جادۂ لذّت پہ سبک گام
آخر کو مگر دل پہ گرانی ہی پڑے گی

گو دست کشی دل کو سہاروں سے بہت ہے
ڈوبے گی تو یہ نبض دکھانی ہی پڑے گی

ہر ایک بلا سر پہ ہمارے صفتِ زیست
جب آن پڑے گی تو اُٹھانی ہی پڑے گی

ہم کھوؤں ہوئے لوگوں کو ڈھونڈے گا بھلا کون
اب اپنی خبر خود ہمیں لانی ہی پڑے گی

آزار یہ پہلو سے نکل جائے تو اچھا
دل ہو گا تو پھر چوٹ بھی کھانی ہی پڑے گی

خورشیدؔ غزل تم یہ سرِ بزم سنا دو
کچھ اور نہیں ، طرح روانی ہی پڑے گی

○

بپا دل میں پیہم یہ ماتم رہا
مجھے اپنے امکان کا غم رہا

حسیں جنتوں سے گزرتے ہوئے
مرے ساتھ میرا جہنم رہا

مجھے رونقِ بزم سمجھا گیا
مگر بزم میں مَیں بہت کم رہا

دلوں پر وہی زنگِ فرسودگی
وہی شکوۂ دہر باہم رہا

ہوئی بات جب بھی کوئی لازوال
بہت دیر تک وقت برہم رہا

ہوئے رنگ اور لفظ گردِ سفر
رہا تو بس اک دیدۂ نم رہا

نہیں چھو سکے آسماں کو تو کیا
ارادہ تو دل میں مصمم رہا

○

بادل سرِ آسماں رواں ہے
اور دل میں خیالِ رفتگاں ہے

ہے یوں تو گراں ہی زندگانی
پر آج کی شب بہت گراں ہے

کچھ بار ہے لطفِ دشمناں کا
کچھ رنجِ جفائے دوستاں ہے

ہے دار پہ حلقۂ رسن تنگ
اور موج میں طبعِ سرکشاں ہے

ہم وقت کے پار جا رہے ہیں
اے عمرِ گزشتہ تو کہاں ہے

آغوش میں لے سکوں تو جانوں
وہ کیا ہے، جسم ہے کہ جاں ہے

یا کوہِ گراں سبک ہے دل پر
یا پھول کی پنکھڑی گراں ہے

جزیرہ

مری زندگی اب
انا کے جزیرے میں سلکرک☆ کی زندگی ہے
کوئی لمس، کوئی صدا، کوئی خوشبو، کوئی ذائقہ، کوئی چہرہ
شناسا نہیں ہے
سمندر کی نمکین لہروں میں
اپنے ہی چہرے کے بنتے بگڑتے خدوخال سے
زندگی میں نمک ہے
مری ناتواں انگلیاں، وقت کی آہنی انگلیوں کے
فشارِ مسلسل میں تھکنے لگی ہیں

ازل سے یہ بگڑی ترازو
یہ انساں کا وقت سے نامساوی تصادم
مشیت کا اک جبر ہے، حُسنِ ظن ہے، تماشا ہے،
کیا ہے؟

زمانوں جہانوں پہ پھیلے کسی کے ارادے
ہمارے دُکھی دل کے قرطاس پر کتنے زخموں کی تحریر
لکھتے رہے ہیں

اسی رسمِ افسوس میں
میں فسردہ بھی ہوں وقت سے پنجہ افگن
سمندر سے اٹھ کر سمندر میں غرقاب ہوتے ہوئے
سورجوں اور ستاروں کی تسبیح کو گن رہا ہوں

انھی سورجوں اور ستاروں کی لَو پر
دمک اٹھے شاید وہ بھٹکا سفینہ
جو میری کھلی آنکھ کے خواب کی سرد اور زرد محراب میں
سُرخ روشن دیا ہے

٭ سکاٹ لینڈ کا ملاح Alexander Selkirk (۱۶۷۶ء - ۱۷۲۱ء) جو چار سال چار ماہ ایک دور افتادہ جزیرے پر تنہا رہا۔ ڈیفو کے "روبنسن کروزو" کا کردار اسی کی شخصیت سے ماخوذ ہے۔ ولیم کوپر نے اس کی تنہائی پر ایک یادگار نظم لکھی ہے۔

○

سماں غروب کا دل میں رہا ابھرتے ہوئے
خیال خاک میں ملنے کا تھا، سنورتے ہوئے

زمیں اداس ہے اور آسماں پہ، خندہ کناں
گزر رہے ہیں ستارے اداس کرتے ہوئے

بکھر گیا تو مجھے کوئی غم نہیں اس کا
کہ راز مجھ پہ کئی وا ہوئے، بکھرتے ہوئے

فسردہ اتنی ہے اس بار رہگوار خیال
خرامِ یار جھجکتا ہے گل کترتے ہوئے

مجھے بھی اپنا دلِ رفتہ یاد آتا ہے
کبھی کبھی، کسی بازار سے گزرتے ہوئے

زمانہ لب پہ یہ انگشت رکھ کے کہتا ہے
کہ دردِ دل نہ کہو اور کہو تو ڈرتے ہوئے

لبوں سے نیم تبسم بھی اٹھ گیا خورشید
اداسیوں کا مداوا تلاش کرتے ہوئے

○

حیران ہیں اہلِ دل خدایا
کیا تُو نے یہ سلسلہ بنایا

جس چیز پہ شوق سے نظر کی
اس چیز نے ہم سے منہ چھپایا

جو صفحۂ دہر پر نہیں تھا
کیوں خواب میں وہ چمن دکھایا

کانٹوں نے پاؤں میں خلش کی
پھولوں کی طلب نے دل دکھایا

میں قریۂ خواب کا مسافر
تعبیر میں کون کھینچ لایا

○

صرفِ خزاں ہیں کس کے رنگ ، وجہِ بہار کون ہے
ابلقِ صبح و شام کا شاہسوار کون ہے

دیکھ رہا ہوں دُور سے اپنی شبیہِ سربلند
میں نہیں بستۂ رسن ، پھر سرِ دار کون ہے

وہ تو جہاں گیا تیرگیاں رہیں نہیں
نُور کو کیا خبر ، کہاں ، تیرہ و تار کون ہے

کچھ نہ کھلا کہ راز کیا سلسلۂ سخن میں ہے
حرف کے اِس طرف ہوں میں ، حرف کے پار کون ہے

مجھ کو بھی کچھ بتا کہ تُو ، کس سے ہے محوِ گفتگو
اے دلِ زار کون ہے ، اے دلِ زار کون ہے

○

زہراب ہوں میں یا قند ہوں میں
یا دونوں کا پیوند ہوں میں

خوشبو سے بچھڑ جاؤں نہ کہیں
نافے کی طرح سر بند ہوں میں

بدحال سہی ، شہزادہ ہوں
پامال سہی ، الوند ہوں میں

مرا ذرّہ ذرّہ جاگتا ہے
بغداد ہوں مَیں، سرہند ہوں مَیں

مَیں تیری سمجھ میں کیا آتا
آزادۂ چون و چند ہوں مَیں

مَر جانے کی شرطیں سوچ کے رکھ
وعدے کا بہت پابند ہوں مَیں

مُدّت میں مِلے اور اتنا کہا
آباد ہوں مَیں، خورسند ہوں مَیں

○

دل کو پیہم وہی اندوہ شماری کرنا
ایک ساعت کو شب و روز پہ طاری کرنا

اب وہ آنکھیں نہیں ملتیں کہ جنھیں آتا تھا
خاک سے دل جو اُٹھے ہوں انھیں جاری کرنا

موت کی ایک علامت ہے، اگر دیکھا جائے
رُوح کا چار عناصر پہ سواری کرنا

تُو کہاں مرغِ چمن ، فکرِ نشیمن میں پڑا
کہ ترا کام تو تھا نالہ و زاری کرنا

ہوں میں وہ لالۂ صحرا کہ ہُوا میرے سپرد
دشت میں پیرویٔ بادِ بہاری کرنا

اس سے پہلے کہ یہ سودا مرے سر میں نہ رہے
دستِ قاتل کو عطا ضربتِ کاری کرنا

یہ جو ٹپکا ہے زباں پر سو کرم ہے یہ ترا
اب رگ و پے میں اسے جاری و ساری کرنا

بخشنا لعل و جواہر سے سوا تابِ سخن
خاک کو انجمِ افلاک پہ بھاری کرنا

ہُوک

جب کتابوں کے نوشتوں سے پھسل کر
مری درماندہ نگاہ
چار سُو پھیلے ہوئے صفحۂ ایام پہ جا پڑتی ہے
دل میں اِک ہوک سی اُٹھتی ہے
ابھر آتے ہیں دُکھتے ہوئے جانکاہ سوال
پھر اسی ہوک کے لہجے میں خدا بولتا ہے

"زندگانی کی کڑی شرطیں ہیں
یہ عبادت ہے تمھاری کہ مرے بخشے ہوئے دکھ جھیلو
ان پرندوں کا، بہائم کا تصوف دیکھو

کیسے منقار شکستہ طائر
دانے دانے کو ترس جاتا ہے دانوں میں گھرا
مشتِ پر خاک میں ڈھل جاتی ہے رفتہ رفتہ
جان کھو دینے کے بے زار ارادے کے بغیر
کسی شکوے کے بغیر"

اور یہ مجھ سے بڑا درس سمجھ میں نہیں آتا میری
کس لیے اُس کی مشیت نے کیا دکھ پیدا
سوچتا ہوں تو ڈھلک آتے ہیں اشکوں میں سوال
ہے مری سوچ مرے اپنے لیے ایک عذاب
اُس پہ عائد ہی نہیں میرے سوالوں کا جواب

○

فرصت ہی نہ تھی نغمۂ تارِ رگِ جاں سے
ہنگامۂ دنیا کو سنا گوشِ گراں سے

اے حسرتِ خوش فہم، ترے وہم بھی ہیں خوب
خوشبوئے بہار آنے لگی بادِ خزاں سے

جس طرح سمندر سے گزرتا ہے سفینہ
مجھ کو بھی گزرنا ہے جہانِ گزراں سے

تھمنے سے مرے سیلِ زمانہ نہیں تھمتا
دنیا ہے روانی میں ، الگ عمرِ رواں سے

کھلتا ہے کوئی راز تو رہ جاتا ہوں حیران
پوشیدہ ہے کیا کیا مری چشمِ نگراں سے

مٹی میں تو رنگوں کے خزانے نہیں ہوتے
کیوں ، اے گلِ نورستہ ، تو آیا ہے کہاں سے

بے درد ہیں اور درد سنانے پہ ہے اصرار
کچھ دل میں نہیں اور شکایت ہے زباں سے

○

اے دردِ نہاں مار ہی ڈالا مجھے آخر
اس رنج سے باہر نہ نکالا مجھے آخر

کب تک عملِ گریہ رہا کچھ نہیں معلوم
خود میری طبیعت نے سنبھالا مجھے آخر

ہستی مری خود میری تہِ دل میں تھی معدوم
گرداب کی گردش نے اُچھالا مجھے آخر

پھولوں سے، ستاروں سے، شراروں سے گزارا
اک شعلۂ بے تاب میں ڈھالا مجھے آخر

ڈرتا ہوں بہت روشنیٔ طبع سے خورشیدؔ
اندھا ہی نہ کر دے یہ اجالا مجھے آخر

○

میں ہوں خود سے بھی خفا، مجھ کو لبھائے نہ کوئی
مہرباں ہو کے کبھی پاس بُلائے نہ کوئی

وقت ہر دور میں تھا دل کی امنگوں کا رقیب
فیض اس پیرِ جواں بخت سے پائے نہ کوئی

ایک تصویر جو ہو مائل تصویرِ دگر
ساتھ ساتھ ان کو زمانے میں سجائے نہ کوئی

ہاں وہی دشت، وہی گم شدگی اچھی تھی
اب کے بھٹکوں تو مجھے راہ پہ لائے نہ کوئی

میں کسی راز کا پردہ نہیں ہونے پاتا
پردہ کرتا ہو تو پھر مجھ میں سمائے نہ کوئی

○

حسرت ہے نظر کو کہ نظر آئیں پرندے
معدوم تو منظر سے نہ ہو جائیں پرندے

چلتے ہوں تو قدموں میں بچھا جاتا ہو سبزہ
شاخیں کہیں لہرائیں، کہیں گائیں پرندے

اُن کانپتی پلکوں میں وہ نم ہوتی ہوئی آنکھ
یوں جیسے کسی جھیل پہ منڈلائیں پرندے

وہ آگ برستی ہے کہ کتراتے ہیں دریا
وہ حبس کہ اڑتے ہوئے گھبرائیں پرندے

ویراں ہیں شجر اور گھروں میں نہیں آنگن
اے کشمکشِ رزق کہاں جائیں پرندے

تا حدِ نظر دام کہ دانہ نہیں جس میں
ہیرے کی کنی عام، اگر کھائیں پرندے

آرامِ قفس وہ کہ نشیمن نہ رہے یاد
چاکِ قفس ایسا کہ گزر آئیں پرندے

○

جھیل گیا تمام زور ، یورشِ ماہ و سال کا
روپ ترے خیال کا ، رنگ مرے ملال کا

ہم سخن سے آدمی ، ہمسر ہمنشیں نہیں
صحبتِ روز و شب میں ہے فصل ہزار سال کا

عینِ وصال میں بھی ، ایک سے حال میں بھی
ایک سے حال میں مگر فرق بہت ہے حال کا

ہے مرے سینے میں کہیں ایک خروشِ بے نمود
سوئے ہوئے پہاڑ میں اٹھتے ہوئے ابال کا

اس کو کسی سے کیا غرض جس دلِ بے نیاز کو
شوق نہ ہو عروج کا خوف نہ ہو زوال کا

ہے کبھی میرا سنگِ میل اور کبھی میری گردِ راہ
دل کہ نہیں ہے راہ رَو جادۂ اعتدال کا

○

وہی بہار وہی شغلِ بادہ پیمائی
وہی خیال وہی اُس کی بے سروپائی

کُھلے ہوئے ہیں دریچے ہر ایک سمت مگر
کسی طرف سے کچھ اپنی خبر نہیں آئی

محبتیں بھی کیں ، اور نفرتیں بھی کیں
نہ آدمی نے مگر آدمی کی تہ پائی

یہ اعتماد تو دیکھو بھرے سمندر میں
حباب کھینچ کے بیٹھا حصار تنہائی

تم اپنے آپ میں گم تھے تو ایک عالم تھا
بُرے کو دھیان پڑا ذوقِ عالم آرائی

زمانے کا مرے خوابوں پہ کچھ اثر نہ ہوا
وہی نکھار وہی تازگی و رعنائی

خدا بھی خلق میں چاہے کہ آئنہ دیکھے
اُسے بھی راس نہ آیا سرورِ یکتائی

○

وقتِ ہجرت کا ہے ہجرت کی زمیں نامعلوم
کس مکاں کا ہو دلِ زار مکیں نامعلوم

ثبت پتھر پہ ہو دیکھیں کہ ہوا میں اُڑ جائے
یہ مرا نام کہ ہے جس کا نگیں نامعلوم

خواب میں دیکھ لیا کھو دیا بیداری میں
کہیں معلوم ہے تُو اور کہیں نامعلوم

جتنے اسباب طرب دہر میں ہیں سب موجود
کیا تقاضا ہے جرا طبع حزیں نامعلوم

گونج اپنی ہے کہ آتا ہے سوالوں کا جواب
اس خرابے میں کوئی ہے کہ نہیں نامعلوم

کس کو دوں اپنی طبیعت کی وراثت خورشید
اک امانت ہے مرے پاس امیں نامعلوم

انقلاب

کیا کھرے کھوٹے میں رکھا ہے

کہ سکہ تو چلن کا نام ہے

اس قدر پایا غل وغش نے فروغ

صیرفی آخر بدلوانے لگے اپنے محک، اپنے عیار

میں زرِ خالص ہوں، ہر بازار میں مشکوک ہوں

یہ کھرا ہونا بھی ہے کیسا عذاب

انقلاب، اے انقلاب

سالگرہ

جیسے اک سانپ ہے ڈستا ہے مجھے سال بہ سال
جب پلٹ کر وہی موسم وہی دن آتا ہے
پھولنے لگتا ہے مجھ میں وہی مسموم خمیر
اُس کا بوسہ مری پوروں میں مہک اٹھتا ہے

اور وہ اپنی ہی خوشبو کی کشش سے بے چین
میں کہیں بھی ہوں، مرے پاس چلا آتا ہے
در و دیوار اُسے راستہ دے دیتے ہیں
اور میں اُس کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہوں

نیل بڑھتے چلے جاتے ہیں مگر چارہ نہیں
ہے مری زیست کی تصدیق یہی زہر کی مُہر
جس سے انکار کی قیمت ہے مرا اپنا وجود

○

ماضی کو بھی دیکھیں گے اب اپنی ہی نظر سے
اس کی بھی خبر کچھ نہ ملی ، اہلِ خبر سے

کچھ گم ہوئے اوراق روایت میں نہ آ کر
کچھ مسخ ہوئے حُسنِ روایت کے اثر سے

فرسودگیِ رنگِ گلستاں سے ہُوں بیزار
اُکتایا ہُوا برگ و بر و شاخ و ثمر سے

آئے تو سہی سامنے وہ عکسِ گریزاں
آنکھیں بھی نہ جھپکوں گا گزر جانے کے ڈر سے

گردش میں ہیں سب دشت و دیار و در و دیوار
وہ بھی ہیں سفر میں کہ جو نکلے نہیں گھر سے

فارغ نہیں میں خود سے کہ رہتا ہے شب و روز
آشوب مرے دل میں مرے فتنہ سر سے

○

خیالات لفظوں میں ڈھالے بہت
بنائے پہاڑوں کے گالے بہت

کشش نے تری اے جبینِ نیاز
صنم پتھروں سے نکالے بہت

زمیں کا سفر بے جہت ہے تو کیا
کتابِ فلک کے حوالے بہت

شب تیرہ میں ہو کوئی دستگیر
سحر ہوتے ہوتے اُجالے بہت

نہیں گوہر دل کی کوئی نظیر
سمندر جنوں نے کھنگالے بہت

ہر اک لمحہ ہے ایک کوہ ندا
بلاوے بہت آنے والے بہت

سمٹتا نہیں خواہشوں کا سفر
مسافت ہے کم اور چھالے بہت

○

کہیں شطرنج کے خانے ستارے
کہیں تسبیح کے دانے ستارے

ہم آغوشی، سحر تک، ظلمتوں نے
بہت چاہی، نہیں مانے ستارے

زمیں پر اجنبی صدیوں کی یلغار
فلک پر جانے پہچانے ستارے

یہ لشکر، یہ الاؤ، یہ خم و پیچ
چلے ہیں کس سے ٹکرانے ستارے

سراسر بے نیازِ مطلعِ صبح
رواں رہتے ہیں دیوانے ستارے

○

ہم اِس دشت سے کیوں گزارے گئے
کہاں بال و پر وہ ہمارے گئے

رہا اِس سے آگے سہاروں کا وہم
قدم دو قدم تک سہارے گئے

تہِ خاک سب مسند آرائے خاک
اکیلے اکیلے اُتارے گئے

نہ تھا تیرگی میں کوئی ہم سفر
فقط ہم گئے یا ستارے گئے

ذرا دُور پر روشنی بھی رہی
مگر ہم اندھیرے میں مارے گئے

○

پیڑ جلے کس لیے
پھول کھلے کس لیے

کھل اٹھے غنچے تو پھر
ہونٹ سِلے کس لیے

دستِ صبا نرم تھا
زخم چھلے کس لیے

وہ جو ملے صبح و شام
پھر نہ ملے کس لئے

لب پہ تبسم ہے کیوں
دل میں گلے کس لئے

مانگنے لگتا ہے دل
غم کے صلے کس لئے

○

کام پڑے رہ گئے
دل میں گڑے رہ گئے

دید کی فرصت نہ تھی
خواب پڑے رہ گئے

ختم سفر ہو گیا
کوس کڑے، رہ گئے

آنکھ کھلی رہ گئی
عکس جڑے رہ گئے

جا کے نہ آئی ہوا
پیڑ کھڑے رہ گئے

بات پہ اپنی اڑے
اور اڑے رہ گئے

○

نہ موجِ بادِ صبا گُل کھلانے آئے گی
نہ اب چمن میں خزاں خاک اُڑانے آئے گی

نکل گیا ہے سفینہ کھلے سمندر میں
نہ کوئی غم نہ خوشی دل دکھانے آئے گی

وفائے یار سے بھی بے نیاز ہے اب دل
جفائے یار بھی کیا منہ دکھانے آئے گی

غرض حیات کے سب امتحان ختم ہوئے
بس اب تو موت مجھے آزمانے آئے گی

وہ جاں کنی کی کم آمیز نیلگوں ساعت
دبے قدم جو کسی دن سرہانے آئے گی

وہ اپنے سرد لبوں کے اداس بوسے سے
مرے لہو کی حرارت چرانے آئے گی

بس ایک لمحۂ لرزاں میں اختصار کے ساتھ
وہ عمر بھر کی کہانی سنانے آئے گی

○

پوشیدہ ہے تہوں میں پھرتی ہے ساحلوں میں
اک آگ سی رواں ہے ہر سمت پانیوں میں

چیتے کی جست جیسے، اک چشمِ مست جیسے
کیا کیا خیال آئے جنگل کی بارشوں میں

پو پھوٹتے ہی دوڑا چاندی کا حاشیہ سا
جلتے ہوئے دیوں کی بجھتی ہوئی لووں میں

وہ آ گیا تو جیسے سبزے میں جان آئی
دوڑی رمق ہوا کی ساکت صنوبروں میں

کچھ زخم رہ گئے ہیں، شعلے سے، دل کے اندر
کچھ درد بہہ گیا ہے، پانی سا، آنسوؤں میں

لرزاں ہے شاخِ دل پر اک یاد کا نشیمن
تپتے ہوئے دنوں کی مہکی ہوئی شبوں میں

شاید اسی لئے ہے شوریدگی زیادہ
آنے لگا سمندر گھٹ کے ندیوں میں

کب زندگی ہوئی ہے اُس کے اثر سے خالی
رہتا ہے وہ ابھی تک اندر کے ولولوں میں

رفتار آسماں میں کوئی کجی نہیں ہے
ساری کجی نہاں ہے آنکھوں کے زاویوں میں

اے اشکِ غم بپھر کر یہ بام و دَر بہا دے
کب تک پڑا رہے گا، دُکھتے ہوئے دلوں میں

دِل سمجھتا ہے

چمنِ زیست میں ہیں فصلِ خزاں کے آثار
وقت کہتا ہے کہ تم کل بھی تھے گرد آج بھی ہو
دل سمجھتا ہے کہ اب گرد بھی کب باقی ہے
اب تو شریانوں سے تھم تھم کے گزرتا ہے لہو
آہ یہ میرا دلِ زار یہ بڑھتا ہُوا بوجھ
بھول جانے کی سہولت جسے حاصل ہی نہیں

غوّاص

میں کیسا عجیب آدمی ہوں
اَن دیکھے سمندروں کا غوّاص
سنسان تہوں میں سانس روکے
مٹھی میں دبائے گوہرِ خاص
جب سطح پہ آنکھ کھولتا ہوں
مبہوت خلا میں بولتا ہوں

○

جب یاد کے سائے میں ستائے فراموشی
تصویر بھی دیکھوں تو یاد آئے فراموشی

آنکھوں کو شکایت تھی یادوں کے عذابوں سے
اب دیکھئے جو کچھ بھی دکھلائے فراموشی

دو دن کو ہے یہ سارا ہنگامہ من و تُو کا
ہر نقش بہا دے گا دریائے فراموشی

اُس دل کے بھی ہو شاید باقی کسی گوشے میں
اِک یاد جسے کہیے ، ہمتائے فراموشی

معمورۂ ہستی میں ہر شے کا مقدر ہے
امروزِ شناسائی ، فردائے فراموشی

ہر بام کے ماتھے پر فرمانِ فنا کندہ
ہر یاد کے باطن میں ایمائے فراموشی

جو خاک نشانی تھی اک صورتِ پنہاں کی
اب وہ بھی پریشاں ہے ، اے وائے فراموشی

پوچھو نہ خبر اس سے گُم گشتہ بہاروں کی
ہے طائرِ دل وقفِ سرمائے فراموشی

خورشید ، سُنا تُو نے اُس بزم میں کل تیرا
وہ ذکر ہُوا جس سے شرمائے فراموشی

○

وہ مجھے خاک سے باہر نہیں جانے دیتے
دستِ ساحل سے سمندر نہیں جانے دیتے

سطح پر آئے ہوئے بن کے کف و موج و حباب
زیرِ دریا بھی گوہر نہیں جانے دیتے

ہیں مری راہ کا پتھر، مری آنکھوں کا حجاب
زخم باہر کے جو اندر نہیں جانے دیتے

مجھ کو اس گنبدِ بے در سے پرے کا بھی ہے ذوق
یہ مرے بال، مرے پَر نہیں جانے دیتے

حدِ افلاک پہ جا کر تو صدا دے آیا
مگر افلاک سے اوپر نہیں جانے دیتے

○

جب پاؤں صبا بہرِ تگ و تاز نکالے
یہ شرط ہے اُس پر کہ نہ آواز نکالے

تُو آ تو سہی ، صحنِ گلستاں میں بہر گام
استادہ ہیں سب سرو و سمن ، ساز نکالے

اب بھی کبھی یاد آئے جو وہ سروِ خراماں
دل میں کوئی طائرِ پرِ پرواز نکالے

وہ بھی ہیں بہت عقل پہ نازاں کہ جنھوں نے
خلقت پہ نئے ظلم کے انداز نکالے

آ پہنچا ہے وہ وقت کہ خورشیدِ سرِ بزم
جو دل میں چھپا رکھا ہے ، وہ راز نکالے

○

ہمیں رکھتی ہے یوں قید مقام آزردہ
کہ جیسے تیغ کو رکھے نیام آزردہ

ہے جانے کس لئے ماہِ تمام آزردہ
کھڑا ہے دیر سے بالائے بام آزردہ

گریباں چاک کر لیتی ہیں کلیاں سن کر
ہوائے صبح لاتی ہے پیام آزردہ

بتا اے زندگی یہ کون سی منزل ہے
بے خواب آنکھوں سے اور لب سے کلام آزردہ

یہ خاک سست رو اس کے ہیں اپنے عنصر
نہ ہو اس سے ہوائے تیز گام آزردہ

گری ہے تاک پہ شاید چمن میں بجلی
پڑے ہیں سرنگوں مینا و جام آزردہ

غزل کس بحر میں خورشیدؔ یہ لکھ ڈالی
نہ کر محفل کو یوں اے کج خرام آزردہ

○

گھر بھی جھکے جھکے سے ہیں در بھی جھکے جھکے
بستی کے ہیں تمام شجر بھی جھکے جھکے

سبزے میں ہے خرامِ صبا بھی اُداس اُداس
شاخوں پہ طائروں کے ہیں پَر بھی جھکے جھکے

افسردگی سے دستِ طلب میں سکت نہیں
گُل بھی جھکے جھکے ہیں، ثمر بھی جھکے جھکے

ایسا زوال ہے کہ بلندی نہیں کہیں
مدت سے سرکشوں کے ہیں سر بھی جھکے جھکے

منظر کی پستیوں سے نگاہیں بھی پست ہیں
محو نظر ہیں اہل نظر بھی، جھکے جھکے

انگڑائی لے کے وقت کہیں اٹھ کھڑا نہ ہو
دکھتی ہے آسماں کی کمر بھی جھکے جھکے

پلکیں اٹھا کہ پھر سے رواں کائنات ہو
تھکنے لگے ہیں شمس و قمر بھی جھکے جھکے

○

مجھ سے محروم رہا میرا زمانہ خورشید
مجھ کو دیکھا، نہ کسی نے مجھے جانا خورشید

آنکھ میں تھی کہیں تازہ کہیں فرسودہ نگاہ
زیرِ افلاک، نیا کچھ نہ پرانا خورشید

ڈھونڈنا ہے تو مجھے ڈھونڈ سخن میں میرے
تابِ خورشید حقیقت ہے فسانہ خورشید

ڈوبتی شام یہ کہتی ہے ہلاتے ہوئے ہاتھ
صبح دم دیر نہ کرنا ، پلٹ آنا خورشید

اُس کے آنسو میں ہے ڈوبے ہوئے تاروں کا ملال
اخترِ صبح سے آنکھیں نہ مِلانا خورشید

راہ میں گوہر و زر ، خوف و خطر ، کچھ بھی سہی
گزر آنا ، گزر آنا ، گزر آنا خورشید

یہ جہانِ گزراں لائقِ اندیشہ نہیں
دِل بھی ٹوٹے تو ذرا دِل نہ دُکھانا خورشید

○

خوفِ زیاں کے واسطے ، خواہشِ سُود کے لئے
کشتیِ جانِ ناتواں ، بحرِ وجود کے لئے

دھوپ کے پاس ایک ہی چادرِ ہفت رنگ ہے
سرخ و سیاہ کے لئے ، سبز و کبود کے لئے

موجِ ہوا کے سامنے ایک شرر کی کشمکش
بود و نبود کے لئے ، آتش و دُود کے لئے

نام و نمود سب کی ہے منزلِ آخریں فنا
اور ملی ہے زندگی نام و نمود کے لئے

راحت و رنجِ دہر کے رفت و گزشت سے گزر
خونِ جگر بچا کے رکھ نقشِ خلود کے لئے

لب کہیں ، سامعہ کہیں ، غنچہ کہیں ، صبا کہیں
صورتیں تو یہ تو بنیں ، گفت و شنود کے لئے

ہے مرے دل میں ایک نام اور مرے منہ میں ہے زبان
اُس پہ سلام کے لئے ، اُس پہ درود کے لئے

جانے کیا ہے

جانے کیا ہے موت کیا ہے زندگی
چلتے چلتے کیسے تھم جاتی ہیں تصویریں تمام
خاک ہو جاتی ہے پھر سے مشت خاک
گاہے گاہے سنگ ہو جاتے ہیں چہروں کے نقوش
اپنے اپنے زاویے پر منجمد
دم بخود رہتے ہیں محوِ انتظار

ناتمام

○

تُو نے کبھی سوچا ہے کہ وہ کون ہے جس نے
آواز تجھے ، ذوقِ سماعت مجھے بخشا

پہلے رسن و دار کو رفعت سے نوازا
پھر اُن کے برابر قد و قامت مجھے بخشا

○

زندگی کٹتی چلی جاتی ہے ، اِس کا نہیں رنج
رنج یہ ہے کہ کبھی ڈھنگ سے زندہ نہ رہے

اِسی دورانِ اسیری میں کبھی ہم سے ملو
جانے کب خاک کے پنجرے میں پرندہ نہ رہے

○

اُن پرندوں کو نشیمن سے بھلا کیا لینا
جن کو پرواز کے دوران میں مَر جانا ہے

پھیل جاتی ہے بہر گام مری حدِ سفر
سخت مشکل ہے کہ تا حدِ نظر جانا ہے

○

بھلانا بہت دُور کی بات ہے
کہوں کیا کہ تجھ کو بھلایا نہیں

کہ مَیں نے کبھی چہرۂ غیر سے
نظر کا دیا تک جلایا نہیں

○

یہ اپنا ذوق ہے اور اپنی اپنی فطرت ہے
جواز تو نہ خوشی کا یہاں نہ غم کا ہے

رمق تو دل سے گزرتی ہے چارہ جوئی کی
مگر خیال ترے زخم محترم کا ہے

○

دعا یہ ہے کہ تنو مند ہو شجر میرا
نہ یہ کہ صحنِ گلستاں میں آندھیاں نہ چلیں

شکست کھا کے بھی رفتارِ عاشقاں ہے وہی
عناں گسستہ چلیں اور کشاں کشاں نہ چلیں

○

بھرم اِسی میں تحمل کا ہے کہ مر جائیں
جئے تو پھوٹ بہے گا یہ سب کبھی نہ کبھی

نہ میرے بس میں نہ میری سمجھ میں آتا ہے
یہ میرا دل کہ ہے طوفاں کبھی سفینہ کبھی

○

سوچو تو ہیں فقیر کو آزادیاں بہت
دنیا میں یہ نصیب کہاں بادشاہ کے

جب جی میں آئی مثلِ ہوا اُٹھ کھڑے ہوئے
جب چاہا، ساتھ بیٹھ گئے گردِ راہ کے

○

اے گردشِ دہر، اب تو خوش ہو
پابندِ رواج ہو گئے ہم

پھولوں کو تلاش کرتے کرتے
کانٹوں کی ردا پہ سو گئے ہم

○

زندگی کا یہی ہے رنگ تو پھر
زندگی کو ثبات ہو بھی تو کیا

دل کو ڈوبے ہوئے زمانہ ہوا
اب ترا التفات ہو بھی تو کیا

○

جو شعلۂ تصویر سے جل جائے وہ دامن
جو ابر کو دیکھے سے گہر دے وہ صدف ہوں

جو درد کسی سے نہ اٹھا میں نے اٹھایا
ہر ناوکِ گم کردہ ہدف کا میں ہدف ہوں

○

جیسی شوریدہ سری مجھ میں رہی ہے اک عمر
ویسی شوریدہ سری ہوئے گہستاں میں نہ تھی

کسی ترکش میں کوئی زخم نہ آتے دیکھا
زخم دل میں تھا، خلش دل میں تھی، پیکاں میں نہ تھی

○

تم کو کیا خبر خامہ کس ڈھنگ سے گزرا ہے
کالی روشنائی سے کالی روشنائی تک

○

ہنگامۂ دنیا کا حاصل ہیں سو دو آنسو
اِک اشکِ محبت ہے، اِک اشکِ ندامت ہے

○

بجا کہ فقر کا مسکن دلوں میں ہے لیکن
وہ فقر بھی نہ رہا، جب وہ بوریا نہ رہا

○

کسی کی یاد بھی ہو ۔۔۔ خلوتیں نہیں کافی
خیالِ غیر کو دل سے نکالنے کے لئے

○

بہار تازہ ہے اپنی مہک کی آپ شہید
لئے ہے پھول ہر اک شاخ دستِ نازک میں

○

زباں سے میں بھی لگایا کیا بہت پیوند
کسی طرح مرے دل کی شکستگی نہ گئی

○

شعر ہے ہستیِ موہوم کا اِک عکسِ مزید
میں ہوں تصویر کی تصویر بنانے والا

○

ہر ایک چہرے کو دل سے گزار کر دیکھو
گزر گیا تو ستارہ، ٹھہر گیا تو قمر

○

میں زمانے کی نظر میں ہوں عبث گریہ سرشت
کوئی سمجھا ہی نہیں رنج فراواں میرا

○

آج کس چہرۂ شاداب کو دیکھا کہ ہمیں
طاقِ نسیاں میں جو رکھے تھے، وہ گُل یاد آئے

○

مسکرانے پہ نہ جا، شرطِ مسرت یہ ہے
کہ تہِ دل میں کہیں گوشۂ افسوس نہ ہو

○

گھر بناتے ہوئے سیلاب کا سوچا ہی نہ تھا
اب سرِ بام نہ بے بنیاد کا ماتم کیا کیا

○

ترتیب جس جہاں کو دیا جاگ جاگ کر
اب آنکھ بند کر کے اسے دیکھنا بھی ہے

○

آج بھی بزم میں ہیں رفتہ و آئندہ کے لوگ
ہر زمانے میں ہیں موجود زمانے سارے

○

دلِ حزیں غمِ فردا میں اس قدر گم تھا
خوشی گزر گئی اور اس کو کچھ خبر نہ ہوئی

○

ترے کرم سے قدم کو سہارتی ہے زمیں
مرا غرور سلامت ترے کرم سے ہے

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے مجھے کھا گئے

خورشید رضوی جدید غزل گو ہے مگر وہ اپنی جدت کی نمائش نہیں کرتا۔ اسے نمائش کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ اس کی جدت ہیئت کی بجائے موضوع اور الفاظ کی بجائے مفہوم سے رشتہ رکھتی ہے۔ وہ اپنے رویے اور اپنی سوچ کی جدت کی وجہ سے جدید ہے۔ آخر کار، اسی نوعیت کی جدت سلسلۂ غزل کی ایک ارتقائی کڑی کو مکمل کرے گی اور مستقبل میں آج کے دور کی غزل کی انفرادیت خورشید رضوی کے سے شعرا ہی کی غزلوں سے پہچانی جائے گی۔

بنیادی طور پر خورشید رضوی جذبے کی گہرائیوں اور لطافتوں کا شاعر ہے اور جذبے کی انتہائی باریک پرتوں کو وہ جس بے ساختگی اور سادگی سے اپنی غزل میں چھوتا ہے وہ آج کے دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ آج کل تو جذبے کا قتل ہی نام نہاد جدت کی پہچان ہے۔ مگر جب جذبہ قتل ہوتا ہے تو شاعری بھی دم توڑ دیتی ہے۔ خورشید رضوی کا جذبہ بھی زندہ ہے اس لیے اس کی غزل بھی توانا ہے اور اسی لیے اس کا مستقبل بھی فروزاں ہے۔

احمد ندیم قاسمی